© rasailojaraid.com

فتوحاتِ آصفی

مولانا مودودیؒ کا ایک غیر معروف اور نادر مقالہ

معین الدین عقیل

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) اپنی مذہبی و فکری کاوشوں سے قبل، اپنے ذوق اور اپنی دل چسپیوں کا اظہار ادب اور تاریخ میں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے بچپن ہی میں عربی زبان میں اتنی استعداد پیدا کرلی تھی کہ ۱۳سال کی عمر ہی میں شیخ عبدالعزیز شاویش (۱۸۷۶ء-۱۹۲۹ء) کی تصنیف الاسلام و الاصلاح کا اور ساتھ ہی قاسم امین بے (۱۸۶۳ء-۱۹۰۸ء) کی کتاب المراۃ الجدیدہ کا ترجمہ اردو میں کرسکیں۔[۱] یہ تراجم اس وقت ان کے ذوق کے اولین مظاہر تھے۔ اس ذوق کے ذیل میں، کہ جب مطالعے کی ابھی ابتدا ہے، کسی ایک موضوع کا تعیّن نظر نہیں آتا، بلکہ دل چسپیوں کی طرح موضوعات بھی تنوع کے حامل رہے ہیں۔ کہیں وہ 'برق یا کہربا' کی تصریح و وضاحت کررہے ہیں یا 'انگریزی لغت میں دوستی کے معنی' تلاش کررہے ہیں۔ ایک جانب وہ 'حالاتِ زندگی آنریبل پنڈت مدن موہن مالویہ آف الٰہ آباد' لکھ رہے ہیں تو دوسری جانب 'مسٹر آصف علی بیرسٹر کی بے دردیاں، ٹیگور کے ساتھ' پر اظہارِ خیال کررہے ہیں۔ 'قمار خانۂ مونٹی کارلو' بھی ان کے قلم کی توجہ سے دور نہ رہا۔ خالص ادب اور اس کے قریبی موضوعات بھی ان کی توجہ میں رہے۔ قربان علی بیگ سالک (۱۸۲۴ء-۱۸۸۰ء) سے خاندانی قرابت نے ان کی شاعری پر تین چار مضامین ان سے اسی زمانے میں لکھوا لیے اور 'حسنِ ادا اور ادب' کے تعلق سے اسلوبیات بھی ان کے پیشِ نظر رہے۔[۲]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح کے موضوعات کو اپنی دل چسپی میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ رسائل تاج اور مسلم[۳] اور پھر الجمعیۃ[۴] کے توسط سے صحافت سے وابستگی نے ان کے قلب و ذہن کو عصری مسائل اور حالات وحوادثِ زمانہ سے بھی قریب کر دیا تھا۔ نوجوانی کے زمانے میں ان کے مضامین: 'سمرنا میں یونانی مظالم'، 'ترکی میں عیسائیوں کی حالت' اور 'مصطفیٰ کمال پاشا' عالمِ اسلام کے حوادث اور قومی ادبار سے ان کی دل گرفتگی کی علامتیں ہیں۔[۵] غالباً ترکی کی اسی ابتلا وافتاد کی مثال نے انھیں طویل مضمون 'ہندستان کا صنعتی زوال اور اس کے اسباب پر تاریخی تبصرہ' لکھنے پر مجبور کیا۔[۶] اسی ضمن میں ان میں تاریخ اور تاریخ نویسی سے دل چسپی کا پیدا ہونا غیر متوقع نہ تھا۔ ان کی یہ دل چسپی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ ان کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے رسالوں: تاج، مسلم اور الجمعیۃ میں جو کچھ انھوں نے بحیثیت مدیر لکھا، ان کی تفصیلات معلوم ومرتب نہیں، لیکن خیال ہے کہ حالاتِ حاضرہ کے پس منظر میں ملکی و عالمی، خصوصاً عالمِ اسلام کے حالات نے انھیں ضرور تاریخی تناظر اپنے پیشِ نظر رکھنے پر مجبور رکھا ہوگا۔ تاریخ نویسی کے زمرے میں ان کی تصانیف شمار کی جائیں تو، ان کی تفسیر تفہیم القرآن سے قطع نظر، کہ جس میں قبلِ اسلام کے واقعات کی تحقیق وجستجو میں اور ماضی کی اقوام کی تاریخ وتہذیب کے حوالوں میں اپنے مطالعۂ تاریخ سے انھوں نے بالعموم مدد لی ہے، اور اپنی معروف تصنیف الجہاد فی الاسلام میں تاریخ کے حوالے ان کا سہارا بنتے رہے ہیں۔ تاریخ نویسی میں ان کی مستقل تصانیف: دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ: سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر (۱۹۲۸ء)، سلاجقہ، حصّہ اول (۱۹۲۹ء)، تجدید و احیاے دین (۱۹۴۰ء)، دکن کی سیاسی تاریخ (۱۹۴۴ء)، اور خلافت و ملوکیت (۱۹۶۵ء) معروف ہیں۔

تاریخ نویسی میں دکن کی تاریخ سے ان کی دل چسپی کئی اسباب کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں تصنیف وتالیف کے ابتدائی دور میں انھوں نے یا تو محض عصری تقاضوں کے تحت ترکی کو موضوع بنایا یا دکن اور مملکتِ آصفیہ حیدرآباد ان کا موضوع بنے۔ خلیفۃ المسلمین کی سرزمین ترکی اس وقت ابتلا کا شکار تھی اور اس سے ایک نسبت خاندانی بھی تھی کہ ان کی ننھیال کا تعلّق ترکی سے تھا اور اجداد سلسلۂ چشت سے وابستہ تھے اور ہرات (ترکستان) ان کا وطنِ مالوف تھا۔[۷]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مملکتِ آصفیہ حیدرآباد سے ان کا تعلّق جذباتی بھی ہوسکتا تھا کہ اس کا ایک علاقۂ محروسہ اورنگ آباد ان کی جاے پیدایش تھا، جہاں انھوں نے اپنے بچپن کا ایک یادگار وقت گزارا تھا۔ اس کی یادیں تاعمر ان کے ساتھ رہیں۔ لیکن ان کے قلم کی کاوشوں کے تنوع کو دیکھ کر یہ خاندانی اور جذباتی وابستگیاں محض حسنِ اتفاق بھی ہوسکتی ہیں۔

دکن یا مملکتِ آصفیہ کی تاریخ نویسی کے ضمن میں ان کی اولین مستقل کاوش، دستیاب معلومات کے مطابق: دولتِ آصفیه اور حکومتِ برطانیه: سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایك نظر[۸] تھی۔ اس کو موضوع بنائے جانے کی صراحت انھوں نے اپنے پیش لفظ میں بیان کردی ہے۔ ان کے لیے یہ حیران کُن تھا کہ ایک ایسی مستحکم مملکت جو 'پوری برٹش انڈین امپائر کا مرکزِ ثقل' ہو، جسے اپنی ایک کروڑ ۳۰ لاکھ رعایا پر کامل حاکمیت حاصل ہو، جس کا رقبہ یورپ کی عظیم الشان سلطنتوں کے مساوی ہو، اس نے کیوں کر برطانوی سرپرستی کو قبول کرلیا؟ اور اپنی خارجی آزادی اور اپنے فوجی استقلال کو اپنے مساوی بلکہ باج گزار حلیف کے سپرد کردیا؟ اس حیرت کو رفع کرنے یا ایسے پیدا شدہ سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے کہ ڈیڑھ صدی کے حلیفانہ روابط میں دونوں مملکتوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات رہے ہیں؟ اور دونوں نے ایک دوسرے سے دوستی کا حق کیسے ادا کیا ہے؟[۹] یہاں مصنف کا رویہ برطانوی حکومت کے لیے جارحانہ ہوگیا ہے۔ ان کے خیال میں دولتِ آصفیہ نے دوستانہ وفاداری کو نباہنے کی کوشش کی ہے، جب کہ حکومتِ برطانیہ نے اپنے 'یارِ وفادار' کو ہمیشہ مایوس کیا ہے۔[۱۰]

یہ کتاب مولانا مودودی کے الجمعية کے زمانۂ ادارت فروری ۱۹۲۵ء تا مئی ۱۹۲۸ء کے دوران لکھی گئی تھی، جب کہ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف سے قبل متعدد مضامین حکومتِ حیدرآباد اور نظامِ دکن کی حمایت میں اس رسالے میں تحریر کیے تھے۔[۱۱] ان مضامین میں اور اپنی اس کتاب میں مولانا مودودی نے حکومتِ حیدرآباد اور نظام کا دفاع کرتے ہوئے ان کی حکمت عملیوں کی بڑی حد تک تائید وحمایت کی ہے لیکن حکومتِ برطانیہ پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے حکومتِ حیدرآباد کا مجرم قرار دیا ہے۔ حیدرآباد میں اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد، حکومتِ حیدرآباد کی سیاسی مجبوریوں اور مصلحتوں کے تحت یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ آیا حیدرآباد کی حدود میں اس کتاب کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضبط کرلیا جائے؟ لیکن عمالِ حکومت کی آرا میں اختلاف کے سبب معاملہ رفت و گزشت ہوگیا۔[۱۲] اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے بارے میں مولانا مودودی کا جو تنقیدی اور جارحانہ نقطۂ نظر تھا، حکومتِ حیدرآباد کے لیے، مصلحتاً گوارا نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ قبول تھا۔

اس کتاب کی تصنیف کے لیے مولانا مودودی نے جو جستجو اور محنت کی ہے اس کا اندازہ اس کے حواشی میں درج مآخذ کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے جن میں دکن کی تاریخ سے متعلّق ہم عصر اُردو و فارسی مطبوعات ہی نہیں وہ انگریزی کتب بھی شامل ہیں جو اس کتاب کی تصنیف سے ۵۰، ۶۰ سال کے عرصے میں شائع ہوئی تھیں۔ ان سے انھوں نے بھرپور استفادہ کر کے مفید مطلب اور ضروری معلومات اخذ کیں اور جہاں جہاں ضروری محسوس کیا وہاں متعلقہ دستاویزات کے حوالے دیے ہیں۔ واقعتاً تاریخ نویسی کا یہ اسلوب اس وقت اردو میں بہت عام نہیں تھا۔ کم ہی مصنّفین نے اس طرح کے مآخذ کی جستجو اور تلاش اور ان سے حقیقی استفادے کا مظاہرہ کیا ہے۔

دکن یا مملکتِ حیدرآباد کی تاریخ پر مولانا مودودی کی دوسری مستقل اور اہم تصنیف دکن کی سیاسی تاریخ ہے۔[۱۳] "دولتِ آصفیہ اور مملکت برطانیہ" تو ایک عصری تناظر میں لکھی گئی تھی اور ایک عمومی دل چسپی کا اس میں احاطہ نہ تھا، لیکن خود مملکتِ آصفیہ کی تاریخ جس میں اس کے قیام کا پس منظر اور عہد بہ عہد حالات و واقعات شامل ہوں، مولانا مودودی کی نظر میں اس کی ضرورت موجود تھی۔ چناں چہ اپنی مذکورہ کتاب کی تصنیف اور اشاعت کے بعد انھوں نے اس ضرورت کے ذیل میں اپنی اِس تصنیف کے لیے جب وہ ۱۹۳۰ء میں بھوپال میں چند ماہ مقیم رہے تو مواد جمع کرنا شروع کیا تھا اور وہاں سے جولائی ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد منتقل ہوئے تو وہاں اسی جستجو اور مآخذ کی جمع آوری میں منہمک ہوگئے۔ ان کا ارادہ ایک مفصل تاریخ لکھنے کا تھا جو چار جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ انھوں نے اس کا آغاز بھی کردیا کہ ان کے ایک دوست مولوی احمد عارف (م: ۱۹۴۹ء) نے اس کو دیکھ کر مشورہ دیا کہ ان کا منصوبہ تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی کتاب کی ضرورت بھی ہے جو مبتدی طلبہ کے لیے ہو۔ یہ مشورہ انھیں پسند آیا چنانچہ انھوں نے بہت آسان اسلوب میں دکن کے عہدِ قدیم سے قطب شاہی عہد تک کے مختصر حالات لکھ دیے اور خود مولوی احمد عارف نے اس میں شامل کرنے کے لیے مغلیہ عہد اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آصف جاہی عہد کے حالات تحریر کیے۔ اس طرح ایک مشترکہ کوشش سے ایک کتاب تاریخ دکن مرتب ہوگئی اور شائع بھی ہوگئی۔[۱۴] کتاب کے سرورق پر اشاعت کا سنہ ۱۳۴۱ھ اور مولانا مودودی کے دیباچے پر ۱۳۵۱ھ درج ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر خود مولانا مودودی نے اپنی 'خودنوشت' میں 'مختصر تاریخ دکن' کے طور پر کیا ہے لیکن اس کا ذکر ان کی دستیاب تصانیف کی کسی فہرست میں نظر نہیں آتا۔[۱۵] احمد عارف صحافت سے منسلک تھے اور ایک بہت مؤثر اخبار صبحِ وطن کے مدیر تھے، جسے انھوں نے ۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۹ء) سے جاری کیا تھا۔ اس اخبار کو قومی تحریکوں میں قومی امنگوں کی ترجمانی اور حکومتِ وقت کی تائید وحمایت کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ حیدرآباد کے اکابر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ادب اور فنونِ لطیفہ سے خاصی دل چسپی تھی۔[۱۶]

مولانا مودودی کی یہ غیر معروف اور نادر تصنیف اگرچہ طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی لیکن اس کے لیے محنت اور اہتمام خاصے کیے گئے تھے۔ خود بیان کیا ہے کہ اس کا تاریخی مواد نہایت معتبر ومستند مآخذ سے اخذ کیا گیا ہے اور ایسے واقعات شامل کرنے سے گریز کیا گیا ہے جن کی سند مشکوک ہو۔ کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ کے ذہن میں دکن اور اس کے جغرافی، نسلی، لسانی، تاریخی اور معاشرتی حالات کی ایک صاف اور واضح تصویر نقش ہوجائے۔ کوشش کی گئی ہے کہ جو جو قومیں اس علاقے میں وارد ہوئیں اور جو حکومتیں یہاں قائم ہوئیں، ان کے زمانی اور جغرافی حدود اور ان کے پیدا کردہ تغیّرات اور ان کے قائم کردہ اثرات کو نمایاں کیا جائے۔ اس کا ایک امتیاز یہ ہے کہ تاریخِ دکن کے متعلّق جو نظریات قائم کرلیے گئے تھے ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے وہ نظریات اختیار کیے گئے ہیں جو جدید تحقیقات ومطالعات کا نتیجہ ہیں۔ مصنّفین کے اس عمل کے پسِ پشت مزید اہم بات یہی ہے کہ طلبہ کے ذہن میں ابھی سے ایک غیر محسوس طور پر تاریخ کے فلسفیانہ مطالعے کا ذوق پیدا ہوجائے۔[۱۷]

چوں کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی اور اس کا مقصد بظاہر انھیں دکن کی تاریخ سے واقف کرانا تھا لیکن ساتھ ہی وہ ان میں تاریخ کے مطالعے کا ذوق وشوق عام کرنے اور ابھی سے ان میں ایک 'غیر محسوس طور پر تاریخ کے فلسفیانہ مطالعے' کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ایسے اہتمام بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کتاب میں کرتے نظر آتے ہیں، جو منفرد ہیں۔ مثلاً اس کتاب کو موضوعات اور عہد کے لحاظ سے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا، لیکن ہر باب کو بھی ذیلی اسباق میں تقسیم کیا گیا، تاکہ طلبہ ہر عہد کی بھی ذیلی موضوعاتی تفریق و تقسیم کی مصلحت سے واقف ہو سکیں اور تاریخ کو ان کے تناظر میں سمجھ سکیں۔ پھر اساتذہ سے بھی ان مصنّفین کو یہ توقع ہے کہ تاریخ پڑھاتے ہوئے وہ پہلے اپنے سبق کا ایک عمومی خاکہ طلبہ کے ذہن نشین کریں اور دوسرے مرحلے میں واقعات یاد کرائیں۔ لیکن تفصیلات بیان کرتے ہوئے غیر اہم شخصیات اور سنین کو زیادہ اہمیّت نہ دیں۔ اساتذہ سے انھیں یہ بھی توقع ہے کہ تاریخ پڑھانے سے پہلے خود غور کریں کہ تاریخ کے کون سے واقعات زیادہ اہم ہیں اور نقشہ بھی اچھی طرح خود ذہن نشین کریں اور طلبہ کو بھی ذہن نشین کرائیں۔ ان کے خیال میں ہر تاریخی تغیّر اور اہم واقعے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے نقشوں سے رجوع کرنا ضروری ہے۔[۱۸] اس حکمت کے تحت مصنّفین نے نقشوں کا اہتمام بڑی محنت سے کیا ہے اور ان کی مدد سے ہر عہد کی جغرافیائی حد بندیوں کو واضح کیا ہے۔ نسلوں اور زبانوں کے لحاظ سے بھی نقشے شامل کیے گئے ہیں۔

مولانا مودودی نے اس کتاب کے چھے ابواب: ہمارا ملک اور اس کے باشندے؛ دولتِ آصفیہ کا رقبہ اور آبادی؛ پرانے زمانے کی تاریخ؛ دکن کی آریہ اور دراوڑ ریاستیں؛ دکن میں مسلمانوں کی آمد؛ سلطنتِ بہمنیہ؛ دکن کی پانچ ریاستیں، تحریر کیے ہیں۔ یہ ابواب کُل ۱۷۱ صفحات پر مشتمل ہیں، جب کہ کتاب کی کُل ضخامت ۲۲۴ صفحات ہے۔ اس طرح ۵۳ صفحات مولوی احمد عارف نے تحریر کیے تھے۔

یہ کتاب دکن کی تاریخ نویسی میں مولانا مودودی کی ایک درمیانی کڑی ہے۔ اس کی تمہید میں جو باتیں تاریخ کے ضمن میں انھوں نے تحریر کیں، ان سے اور اس کتاب کے خاکے سے تاریخ نویسی کے تعلّق سے ان کے نقطۂ نظر کو اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

دکن کی تاریخ کے ضمن میں اس تصنیف، یا اولین تصنیف سے قطع نظر، ایک مبسوط تصنیف کی صورت میں ایک بڑا منصوبہ ان کے پیشِ نظر رہا جس کا آغاز انھوں نے بڑی دل جمعی اور محنت سے اپنی نسبتاً ضخیم تصنیف دکن کی سیاسی تاریخ سے کیا جو مارچ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اگرچہ ایک وسیع تر منصوبے کے تحت لکھی گئی تھی اور مولانا مودودی اسے ۴۰ ر ابواب تک وسعت دینا چاہتے تھے لیکن یہ محض قیام مملکتِ آصفیہ (۱۷۲۴ء) کے پس منظر ہی کا احاطہ کرتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بانیِ مملکت نظام الملک آصف جاہ اول (۱۶۷۱ء-۱۷۴۸ء) کے دورِ آخر تک کا بھی احاطہ نہ کیا جاسکا اور نادر شاہ (م: ۱۷۴۷ء) کے حملۂ دہلی (۱۷۳۹ء) پر اس تاریخ کا اختتام ہو جاتا ہے۔ جس قدر بھی تاریخی واقعات اور سیاسی حالات اس میں یک جا ہو گئے ہیں وہ مفصل ہیں اور ان کے بیان کرنے میں خاصی وضاحت روا رکھی گئی ہے۔

یہ تاریخ تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب بانیِ مملکت کے اسلاف اور خاندان کے تذکرے پر مشتمل ہے، جب کہ دوسرا باب اورنگ زیب کی رحلت (۱۷۰۷ء) کے بعد قیامِ مملکتِ آصفیہ تک کے عمومی سیاسی واقعات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا باب قیامِ مملکت کے بعد نادر شاہ کے حملے اور اس کے اثرات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس تاریخ کے لکھنے کے لیے جو جو مآخذ، مطبوعہ و غیر مطبوعہ، ضروری ہو سکتے تھے، انھیں پیشِ نظر رکھا جائے۔ اس ارادے میں خاصی کامیابی نظر آتی ہے۔ کتاب کے آخر میں بڑی محنت سے مملکت کا ایک مکمل نقشہ بھی ترتیب دیا گیا ہے جس میں اماکن کے ساتھ ساتھ صوبوں کی قدیم اور حالیہ حدود کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر مزید یہ کہ نقشے کی تشریح بھی کی گئی ہے اور آمدنی کی تفصیلات بھی درج کی گئی ہیں۔ اس طرح اس کتاب کی تصنیف کے لیے مصنف نے خاصی محنت و جستجو کا ثبوت دیا ہے اور وہ مواد و معلومات یک جا کی ہیں جو قدیم و معاصر تاریخوں میں منتشر اور بے ترتیب پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود کہ اس تصنیف میں پیش کردہ دور اور خصوصاً نظام الملک کے حالات اور عہد پر قدیم اور جدید کتابوں کی کمی نہیں لیکن مولانا مودودی کی یہ تصنیف اپنے اسلوب اور معلومات کے لحاظ سے اپنے وقت کے اور آج کے قارئین کے لیے زیادہ پُرکشش اور جاذبِ توجہ ہے۔

دکن کی تاریخ کے تعلّق سے مولانا مودودی کی ان مذکورہ تصانیف کو ان کے اس منصوبے کی جزوی کاوشیں کہا جا سکتا ہے، جو ان کے پیشِ نظر تھا۔ ان کا یہ منصوبہ جو ۴۰/ابواب پر مشتمل تھا، 'تاریخِ دکن کا خاکہ' کے عنوان سے دستیاب ہے اور مولانا مودودی سے متعلّق دستاویزات و اسناد کے مجموعے: وثائقِ مودودی[19] میں شامل ہے۔ اسے انھوں نے ۱۹۲۸ء میں ترتیب دیا تھا۔ یہ ۴۰/ابواب پر مشتمل تھا اور اس کے مطابق مولانا مودودی نے اس کے ۳۴/ابواب کا مواد جمع کر لیا تھا اور ہر باب کا ایک مختصر خاکہ بھی تحریر کر لیا تھا کہ جس کے مطابق انھیں وہ باب تحریر کرنا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن وہ اس منصوبے میں مزید پیش رفت نہ کر سکے، دیگر منصوبوں اور کاموں میں مصروف ہو گئے۔

اپنے اس منصوبے کے تحت وہ فقط اس کے ۱۸؍ابواب کے موضوعات اپنی تصنیف دکن کی سیاسی تاریخ میں سمیٹ سکے تھے لیکن جو کچھ انھوں نے اس تصنیف (دکن کی سیاسی تاریخ) میں تحریر کیا، اگر وہ اس منصوبے کے مطابق، اور اس کے متعینہ معیار کے مطابق ہوتا تو یہ تصنیف شاید مزید بلند معیار اور اسلوب کی حامل ہوتی۔ اس منصوبے کے معیار کا اندازہ، اس کے متعینہ موضوعات یا ابواب کی فہرست سے تو ہوتا ہی ہے لیکن ہر باب کے تحت جو خاکہ یا اس کے خام عنوانات درج کیے گئے ہیں، ان سے قطع نظر ہر باب کے لیے انھوں نے مآخذ کا ایک تعیّن بھی کر لیا تھا کہ اس باب کی تصنیف میں ممکنہ طور پر ان کے لیے کون کون سی کتب مددگار ثابت ہوں گی۔ اس فہرستِ ابواب اور اس کے لیے ممکنہ مصادر و مآخذ کی فہرست کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک تو بہت محنت و جستجو سے ان تمام اہم تصنیف کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں جو کسی انفرادی ابواب کے لیے ناگزیر ہو سکتی ہیں۔ پھر یہ بھی قابل رشک ہے کہ ان کی رسائی یا معلومات میں قدیم و نادر، مطبوعہ و غیر مطبوعہ، فارسی و اردو اور انگریزی، ہر طرح کی کتب شامل تھیں۔ یہ بھی حیران کن ہے کہ ان کی نظر میں متعلقہ موضوعات یا عنوانات پر جدید و قدیم ہر طرح کی انگریزی کتب، ، جو بالعموم ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور کا احاطہ کرتی ہیں، ان کی فہرستوں میں درج نظر آتی ہیں۔ اس طرح اس خاکے سے ان کے مطالعے کی وسعت، تازگی، اور تاریخ سے ان کی غیر معمولی دل چسپی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ یہ خاکہ یا منصوبہ چوں کہ وثائقِ مودودی میں عکسی شائع ہوا ہے، اور چوں کہ مولانا مودودی کا دست نوشتہ ہے، اس میں انگریزی کا ان کا خط بھی نہایت پختہ اور جامع ہے جو انگریزی میں ان کے لکھتے رہنے کا ایک مظہر بھی ہے۔

ان تصانیف سے قطع نظر مولانا مودودی نے دکن کی تاریخ پر مستقل کتابوں کی تصنیف کے علاوہ کم از کم ایک مقالہ ایک اہم تاریخی ماخذ: 'فتوحاتِ آصفی' مصنفہ: ابوالفیض معنی دہلوی کے مطالعے و تعارف پر لکھا ہے جو غیر معروف اور غیر مدون ہے۔ یہ حیدر آباد دکن سے نکلنے والے اخبار روزنامہ صبح دکن کے 'سالگرہ نمبر'، ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں صفحات: ۳۸-۴۲ پر شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کے مدیر مولوی احمد عارف ان کے قریبی دوست تھے جن کے اشتراک سے انھوں نے اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب تاریخِ دکن لکھ کر شائع کروائی تھی۔ اپنی اس مذکورہ تصنیف کے لیے مولانا مودودی نے تاریخی اور مستند معلومات کے حصول کے لیے معاصر اور تازہ ہر طرح کے مآخذ اپنے پیشِ نظر رکھے تھے۔ دکن کی اپنی تاریخ نویسی کا کام انھوں نے، اپنے مذکورہ منصوبے کے ذیل میں، قیامِ مملکتِ آصفیہ (۱۷۲۴ء) کے بعد دارالحکومت دہلی پر نادرشاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) تک ایک لحاظ سے مکمل کرلیا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کام کو بوجوہ آگے نہ بڑھا سکے لیکن اپنے منصوبے کے تحت مآخذ اور معلومات جمع کرتے رہے۔ اس ضمن میں ان کی تصنیف دکن کی سیاسی تاریخ کے مآخذ کی فہرستوں اور کتابیات میں، جو ہر باب کے اختتام پر شامل ہے، دیکھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے احاطہ کردہ دور سے متعلق قریب قریب سارے ہی اہم اور بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ وہ اپنے مصادر میں فتوحاتِ آصفی اور مأثرِ نظامی، مصنفہ: لالہ منسا رام کو زیادہ اہم اور قابلِ اعتماد سمجھتے تھے[۲۰]۔ یہ دونوں مؤرخین باہم ہم عصر تھے اور نظام الملک آصف جاہ اول کے بھی معاصر تھے۔ ان کی مذکورہ تصانیف نظام الملک ہی کے حالات وعہد کا احاطہ کرتی ہیں[۲۱]۔ یہ دونوں فارسی میں ہیں اور تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اسلوب کا تھا کہ فتوحاتِ آصفی منظوم ہے، جب کہ مأثرِ نظامی نثر میں ہے۔

فتوحاتِ آصفی کی طرح ممکن ہے مولانا مودودی نے مأثرِ نظامی کو بھی اپنے خصوصی مطالعے یا مقالے کا موضوع بنایا ہو لیکن فتوحاتِ آصفی پر ان کا مقالہ دستیاب ہے۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک تو مولانا مودودی کا دکن کی تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع اور پختہ تھا اور دوسرے انھوں نے فتوحاتِ آصفی کو اپنی تصنیف دکن کی سیاسی تاریخ کے لیے ایک اہم اور بنیادی ماخذ سمجھ کر اس کا مطالعہ بالاستیعاب کرنا پسند کیا تھا۔ چنانچہ نہ صرف انھوں نے اپنی کتاب میں اس سے ضروری استفادہ کرتے ہوئے اس سے جگہ جگہ معلومات اخذ کیں بلکہ ضرورتاً اس کے اہم اہم اقتباسات بھی درج کیے، جو متعدد مقامات پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

فتوحاتِ آصفی چوں کہ تاحال غیر مطبوعہ ہے اور عام نہیں، اس لیے اس تک رسائی، اس کا حصول اور اس سے ضروری استفادہ ایک خاص جستجو اور تلاش کا نتیجہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی عام نہیں۔ ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور دو نسخے مملکت کے دفتر استیفا میں محفوظ ہیں[۲۲]۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

، جب کہ ایک نسخہ 'گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری، مدراس' میں بھی موجود ہے۔[۲۳] اس کی کمیابی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مودودی نے اس سے استفادے کے لیے یقیناً کافی تگ ودو کی ہوگی۔ انھوں نے جس نسخے سے استفادہ کیا اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کہاں موجود ہے۔ چوں کہ کتب خانۂ آصفیہ کا مخزونہ نسخہ آب رسیدہ اور ناقص الطرفین ہے، اس لیے شاید اس سے استفادہ نہیں کیا گیا، ممکن ہے کہ دفتر استیفا کے نسخے ان کے ملاحظے میں رہے ہوں۔

ابوالفیض معنی دہلوی کے بارے میں شمس اللہ قادری (م: ۱۹۵۳ء) نے تحریر کیا ہے کہ وہ مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴ء-۱۷۲۰ء) کا شاگرد رہا ہے۔ ابتدا میں شاہجہاں آباد کے محلّہ گلاب واڑی کا رہایشی تھا۔ آصف جاہی افواج کے ساتھ اورنگ آباد آیا اور نواب شاہنواز خان صمصام الدولہ (م: ۱۷۵۸ء) کی مصاحبت اختیار کی۔ قاضی محمد صادق اختر (۱۸۰۷ء-۱۸۵۸ء) کے تذکرہ آفتاب عالم تاب' میں اس کا احوال ملتا ہے[۲۴]، جب کہ علی حسن خان (۱۸۶۶ء-۱۹۳۶ء) کے تذکرہ صبح گلشن[۲۵]؛ اور مظفر حسین صبا (م: ۱۹۲۹ء) کے تذکرۂ روزِ روشن[۲۶] میں بھی اس کا احوال موجود ہے۔

شمس اللہ قادری کے مطابق فتوحاتِ آصفی جانشینانِ اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ اور نظام الملک آصف جاہ کی مفصل سوانح حیات ہے۔ اس کا آغاز اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے ہوتا ہے اور اس میں محمد شاہ (۱۷۱۹ء-۱۷۴۸ء) کے پچیسویں سالِ جلوس (۱۷۴۴ء) تک چھے بادشاہوں اور پانچ دعوے دارانِ سلطنت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ تاریخ اور عہد کے لحاظ سے آصف جاہ کے حالات، مختلف صوبہ جات کی حکومت، دربارِ دہلی کی وزارت، دکن کی فتوحات وغیرہ بیان کی گئی ہیں۔ ان واقعات پر کتاب کا دو تہائی حصّہ مشتمل ہونے کی وجہ سے مصنف نے اس کا عنوان 'فتوحاتِ آصفی' رکھا ہے۔ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۴ء تک کے واقعات شامل کرنے کے بعد کتاب ختم ہوگئی ہے۔

[مولانا مودودی کے اس مقالے کا مکمل متن ادارہ معارف اسلامی کراچی کے مجلّے معارف مجلۂ تحقیق، شمارہ ۹ (جنوری-جون ۲۰۱۵ء) میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اس کا اختتامیہ درج کیا جارہا ہے]:

''کاش! ہندستان میں بھی یورپ کی طرح ایسے علمی ادارے قائم ہوتے جنھیں قوم کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیاضی روپے سے بے نیاز کو دیتی اور وہ اس قسم کی کتابوں کو نئے طرز سے مرتب و مہذب کر کے مفید فہرستوں اور انڈکسوں کے ساتھ شائع کرتے، لیکن ایک ایسے ملک میں اس قسم کی تمنا کرنا حماقت سے کم نہیں ہے جہاں غیر ملکوں کی ہر چیز عزیز اور اپنے ملک کی ہر شے حقیر و ناچیز ہے۔ روم و یونان، عراق و ایران اور فرانس و انگلستان کی تاریخ سے تو اعتنا کا یہ عالم ہے کہ ہماری یونی ورسٹی کا سارا نصاب نامہ اس سے بھرا پڑا ہے۔ اور ہندستان کی تاریخ سے یہ بے اعتنائی ہے کہ اس کی تاریخ کو اس نصاب نامے میں بہت تھوڑی جگہ ملی ہے اور اس تھوڑی جگہ کا بھی بیش تر حصّہ ان کتابوں نے لے لیا ہے جن میں ہم اپنے آپ کو غیروں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تاہم ہندستان کی مجموعی تاریخ پر کچھ نہ کچھ پڑھایا تو جاتا ہے۔ دکن جو خود اپنا گھر ہے اور جس کی تاریخ کا علم، اگر فی الواقع تاریخ کا علم ضروری ہے تو.... اس ملک کے ہر بچے کو حاصل ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے، اس تھوڑے سے شرف سے بھی محروم رہا۔

ابتدائی تعلیم سے لے کر یونی ورسٹی کی اعلیٰ تعلیم تک پورے نصاب درس پر ایک نظر ڈالی جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ صرف ثانوی تعلیم میں ملک کے بچوں کو دکن کی تاریخ سے مجملاً روشناس کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد دکن کی تاریخ ہندستان کی عام تاریخ کا ایک ضمیمہ بن کر رہ جاتی ہے جس کو پڑھ کر اس خطۂ ملک کے ایک فارغ التحصیل گریجویٹ کو اپنے درنگل، گولکنڈ، گلبرگہ، بیدر، دولت آباد، بیجاپور اور بیجانگر کے متعلّق اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جتنی وہ اجین، اجمیر، دہلی، قنوج اور پٹنہ کے متعلّق رکھتا ہے۔ اور اس ذخیرۂ علم کا موازنہ اس واقفیت سے کیا جائے جو اسے یونان، روم، فرانس اور انگلستان کے متعلّق حاصل ہے تو شاید یہ اس کے مقابلے میں بالکل ہی حقیر پایا جائے ـــــ پھر اگر ایسی تعلیمی فضا میں نشو ونما پانے کے بعد وہ اپنے ملک کی زینت، اپنے وطن کے علوم وفنون، اپنی قوم کے عالی قدر فرماں رواؤں، سپہ سالاروں اور مدبروں اور اپنی ملّت کے مایہ ناز علما، شعرا، ادبا اور ماہرینِ فنون سے ناآشنا اور ان کی حقیقی عظمت وشان سے بے خبر رہیں اور ان کو ناقابلِ اعتنا سمجھ کر تمام تر دوسرے ملکوں کی تہذیب وتمدن کو خراج تحسین ادا کرنے اور غیر قوموں کے ناموَر ابطال کی ثنا و وصف کے ترانے گانے میں مشغول رہیں، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے''۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی

۱۔ سفیر اختر، ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں، دار المعارف، واہ کینٹ، ۱۹۹۸ء، ص۱۰

۲۔ ان ابتدائی تحریروں کی طباعتی تفصیلات کے لیے، ایضاً، ص ۱۱، اور ایضاً، 'سید مودودی اور ماہنامہ معارف، دار المعارف، واہ کینٹ، ۱۹۹۹ء، ص ۷۹

۳۔ ان وابستگیوں کا ذکر، ضروری تفصیلات کے ساتھ سید مودودی کی 'خودنوشت' میں موجود ہے، مشمولہ: سفیر اختر، ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں، ص۱۹-۴۴، خصوصاً ص ۲۶-۲۸؛ ایضاً، 'سید مودودی اور ماہنامہ معارف'، ص ۹۱-۹۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۸ و نیز محمد رفیع الدین فاروقی، 'مولانا مودودی اور حیدرآباد دکن'، مشمولہ: تذکرہ سید مودودی جلد ۳، مرتبہ جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد، ادارۂ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۱۵

۵۔ اسی ضمن میں مصطفیٰ کامل پاشا کی کتاب مسئلۂ شرقیہ کا اردو ترجمہ بھی شمار کیا جاسکتا ہے جو اگرچہ نیاز فتح پوری کے نام سے 'صوفی پرنٹنگ پریس، منڈی بہاالدین سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا اور اس پر نیاز صاحب کے سہو کی وجہ سے مصنف کا نام 'مصطفیٰ کمال پاشا' چھپ گیا۔ اس بارے میں تفصیلات کے لیے: سفیر اختر، 'سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کا سرمایۂ قلم، بھولی بسری تحریروں کی روشنی میں'، دار المعارف، واہ کینٹ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴، ۲۷-۲۸

۶۔ ان مضامین کی اشاعتی تفصیلات کے لیے: سفیر اختر، ایضاً، ص ۱۰-۱۱

۷۔ سید مودودی، 'خودنوشت'، مشمولہ محولہ بالا، ص ۲۰

۸۔ شائع کردہ: کتب خانہ رحیمیہ، دہلی، ۱۹۲۸ء

۹۔ دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ، اشاعتِ اول، ص ا

۱۰۔ ایضاً، ص ا۔

۱۱۔ محمد رفیع الدین فاروقی، تصنیفِ مذکور میں ان ۱۲ مضامین کی فہرست درج ہے۔ ص ۳۱۵۔

۱۲۔ تفصیلات کے لیے: ایضاً، ص ۳۱۷: اس ضمن میں متعلقہ دستاویزات کو سید شکیل احمد ''مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، چند اسناد و مآثر دکن کی روشنی میں''، مشمولہ: یادگاری مجلّہ بموقع چھٹا آل انڈیا اجتماع جماعت اسلامی ہند، ۲۰ تا ۲۳ فروری، ۱۹۸۱ء، بمقام حیدرآباد، ص ص ۲۵۹-۲۶۳ سے اخذ کر کے آئین کی محولہ بالا اشاعت میں صفحات: ۶-۸ پر نقل کر دیا گیا ہے۔

۱۳۔ مطبوعہ: دار الاشاعت سیاسیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء؛ بعد میں یہ کتاب اسلامک پبلی کیشنز، لاہور سے اگست ۱۹۶۸ء میں اور پھر جون ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۴۔ مطبع عہد آفریں، حیدرآباد، ۱۳۵۱ھ

۱۵۔ مشمولہ: ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں، ص ۱۹، ۴۳۔

۱۶۔ سید محمد جعفری، 'اسٹار ڈائرکٹری' اسٹار پریس، الہ آباد، سن ندارد، ص ص ۴۴۴۔۴۴۵؛ صبح وطن، ۱۹۲۸ء میں جاری کیا تھا، سید ممتاز مہدی، 'حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات'، قومی کونسل برائے قومی زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۴۱؛ دارالعلوم، حیدرآباد سے فارغ التحصیل تھے۔ ۱۹۴۸ء میں یہ اخبار بند ہو گیا، طیب انصاری، حیدر آباد میں اردو صحافت۔ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد، ۱۹۸۰ء، ص ۶۰

۱۷۔ دیباچہ، ص ۲ ۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ مرتبہ: سلیم منصور خالد، شائع کردہ 'ادارۂ معارف اسلامی'، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ص ۲۲۔۵۰

۲۰۔ مولانا مودودی 'فتوحاتِ آصفی'، مشمولہ: روزنامہ صبح دکن، سالگرہ نمبر، ۱۳۵۱ھ، ص ۳۸

۲۱۔ ان دونوں مؤرخین اور ان کی تصانیف پر شمس اللہ قادری نے اپنی تصنیف مؤرخینِ دکن، میں تعارفی شذرات تحریر کیے ہیں۔ مأثرِ نظامی کے لیے: ص ۱۳-۱۵؛ فتوحاتِ آصفی کے لیے: ص ۵-۶

۲۲۔ شمس اللہ قادری، تصنیفِ مذکور، ص ۶؛ یہ آب رسیدہ اور ناقص الطرفین ہے۔ تفصیلات کے لیے: 'فہرست کتب خانہ سرکار عالی'، جلد سوم، دارالطبع سرکار عالی، ۱۳۵۵ھ، ص ۹۶۔ یہاں فہرست نگار نے اس کا عنوان ''تاریخ فتوحاتِ آصفی منظوم (شاہ نامۂ دکن)'' تحریر کیا ہے اور اسے سہواً میر محمد احسن المتخلص بہ ایجاد کی تصنیف قرار دیا ہے۔

۲۳۔ چندر سیکھرن، ٹی، A Catalogue of Persian and Arabic Manuscripts in the Government Oriental Manuscripts Library, Madras مدراس، ۱۹۶۱ء، ضمیمہ، ص ۱۳۔ ان نسخوں میں اس کا عنوان الگ الگ بھی ملتا ہے، جیسے: 'تاریخ فتوحاتِ آصفی منظوم' اور مثنوی فتوحاتِ آصفی'۔ سی۔ اے۔ اسٹوری (C.A. Storey)، Persian Literature, a bio-bibliographical Survey، جلد اول، ص ۶۰۵، ۷۴۸، ۱۳۳۱

۲۴۔ شمس اللہ قادری، تصنیف مذکور، ص ۶

۲۵۔ مطبوعہ: مطبع شاہجہانی، ۱۲۹۵ھ، ص ۴۳۱

۲۶۔ مرتبہ: محمد حسین رکن زادہ آدمیت، کتاب خانۂ رازی، تہران، ۱۳۴۳ش، ص ۷۴۸

© rasailojaraid.com